پاکستان کی عمر کا چالیسواں (۴۰) سال اور اُس کی دینی و تاریخی اہمیت

چونکہ ہم بالعموم شمسی تقویم کے عادی ہیں، لہٰذا عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۴/ اگست ۱۹۸۵ء کو پاکستان نے اُنتالیسواں یوم استقلال منایا ہے۔ گویا اُس روز اس نے اپنی عمر کے اڑتیس سال پورے کر کے اُنتالیسویں سال میں قدم رکھ دیا ہے، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ ہماری دینی تقویم قمری ہے۔ اُس کے حساب سے دیکھا جائے تو کسی قدر مختلف معاملہ سامنے آتا ہے۔ اس لیے کہ پاکستان کا قیام ۲۷/ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ کو عمل میں آیا تھا۔ اس طرح ۲۷/ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ کو اُس کی عمر کے اُنتالیس سال پورے ہو گئے ہیں اور اُس نے چالیسیویں سال میں قدم رکھ دیا ہے۔ (اور ان سطور کی تحریر کے وقت اُس چالیسویں سال کے بھی چار ماہ سے زائد گزر چکے ہیں)

انسان کی پختگی کی عمر، چالیس سال

یہ بات تو قرآنِ حکیم کا ہر طالب علم اور دینی مزاج کا حامل ہر شخص جانتا ہے کہ انسانی زندگی میں چالیس سال کی عمر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور انسان کی پختگی کی عمر چالیس برس ہے۔ چنانچہ سورۂ احقاف کی آیت نمبر ۱۵ میں یہ الفاظِ مبارکہ وارد ہوئے ہیں:

﴿حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً قَالَ ....﴾ (الایۃ)

''یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری پختگی کو پہنچا اور چالیس برس کی عمر کو پہنچ گیا تو اس نے کہا......''

ظاہر ہے کہ اس سے مراد جسمانی بلوغت نہیں ہے بلکہ شعوری اور نفسیاتی پختگی[1] ہے۔ چنانچہ اُس کے ضمن میں یہ آیۂ مبارکہ نص کا درجہ رکھتی ہے۔

آغازِ وحی کی عمر، چالیس سال

اسی طرح اگر اس اُصول کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ ''استثناءات کلیہ'' کو ثابت کرتے ہیں[2] تو سب جانتے ہیں کہ قانونِ قدرت یا سنت اللہ یہی رہی ہے کہ نبوت کا ظہور[3] یعنی وحی کا آغاز چالیس برس کی عمر میں ہوتا رہا ہے۔ (اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ غالباً صرف حضرت مسیح علیہ السلام ہیں، اور ہر شخص جانتا ہے کہ اُن کی تو پوری شخصیت ہی خرقِ عادت[4] کی حیثیت رکھتی ہے) چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں تو صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ بُعِثَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِاَرْبَعِیْنَ سَنَۃً فَمَکَثَ بِمَکَّۃَ ثَلٰثَ عَشَرَۃَ سَنَۃً یُوْحٰی اِلَیْہِ ثُمَّ اُمِرَ بِالْھِجْرَۃِ فَھَاجَرَ عَشَرَ سِنِیْنَ وَمَاتَ وَھُوَ ابْنُ ثَلٰثٍ وَسِتِّیْنَ سَنَۃً (بخاری و مسلم)

”......حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال کی عمر میں مبعوث ہوئے۔ اس کے بعد تیرہ برس مکہ میں مقیم رہے اور آپؐ پر وحی نازل ہوتی رہی۔ پھر آپؐ کو ہجرت کا حکم ہوا تو آپؐ نے ہجرت فرمائی اور دس برس (مدینہ میں مقیم) رہے اور تریسٹھ برس کی عمر میں آپؐ نے وفات پائی۔ (اس کو روایت کیا امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں نے)۔“

پس ثابت ہوا کہ از روئے قرآن و حدیث انسان کی عقلی و شعوری بلوغت اور جذباتی و نفسیاتی پختگی کی عمر چالیس سال ہے۔

۱؎ "Intellectual And Psychological Maturity"

۲؎ "Exceptions Prove The Rule

۳؎ نہ کہ آغاز!!

۴؎ یعنی عام قوانین طبعیہ کے خلاف ہے

بنی اسرائیل کی چالیس سالہ صحرانوردی اور چالیس سال کے بعد انقلابِ حال

اب چونکہ افراد ہی سے اجتماعیت وجود میں آتی ہے اور بقول علامہ اقبال:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ❁ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

لہٰذا قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ اجتماعیتِ انسانیہ میں بھی چالیس برس کی مدت کو اہمیت حاصل ہونی چاہئے، اور قرآن حکیم میں بھی اس کی کم از کم ایک مثال تو نہایت واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ سورۂ مائدہ کے چوتھے رکوع میں تفصیلاً مذکور ہے کہ مصر سے ”خروج“ (Exodus) کے کچھ عرصے کے بعد جب بنی اسرائیل کو ”قتال فی سبیل اللہ“ کا حکم ہوا اور انہوں نے اس سے پہلوتہی اختیار کی اور اللہ کے دو جلیل القدر پیغمبروں یعنی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام اور اُن کے دو وفادار اور تقویٰ شعار ساتھیوں یعنی یوشع بن نون اور کالب بن یفنا رحمہما اللہ کی کل تشویق و ترغیب اور فرمائش و فہمائش کے جواب میں بالکل دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ:

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّادَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ (المائدہ:۲۴)

”......انہوں نے کہا: ”اے موسیٰ! ہرگز ہم اس (سرزمین مقدس) میں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ (یعنی عمالقہ) وہاں موجود ہیں۔ پس جاؤ تم اور تمہارا رب اور تم دونوں جنگ کرو، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔“

تو اس پر ایک جانب تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اس درجہ بیزاری کی کیفیت طاری ہوئی کہ انہوں نے بارگاہِ خداوندی میں اپنی بے بسی کے ذکر کے ساتھ اپنی امت سے قطع تعلق کی اجازت طلب کی:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (المائدہ:۲۵)

”موسیٰؑ نے عرض کیا: اے رب میرے! مجھے تو سوائے اپنی جان اور اپنے بھائی کے (اور کسی پر) کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ پس علیحدگی فرما دے ہمارے اور ان نافرمان لوگوں کے مابین۔“

اور دوسری جانب اللہ تعالیٰ نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ اگر یہ لوگ بزدلی نہ دکھاتے تو ہم ارضِ مقدس ابھی ان کو عطا فرما دیتے، لیکن اُن کے قتال فی سبیل اللہ سے جان چرانے کی بناء پر یہ ارضِ مقدس اُن پر چالیس برس تک حرام رہے گی اور اس عرصے کے دوران یہ اسی صحرائے سینا میں بھٹکتے پھریں گے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ﴾ (المائدہ:٢٦)

''......اللہ نے فرمایا: اب یہ (ارضِ مقدس) ان پر چالیس برس تک حرام رہے گی (اور) یہ زمین میں بھٹکتے (ہی) رہیں گے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اسی چالیس سال کے عرصے کے دوران حضرت موسیٰؑ کا بھی انتقال ہو گیا اور حضرت ہارونؑ کا بھی، اور یہ دونوں جلیل القدر پیغمبر اللہ کے دین اور اپنی امت کے ارضِ مقدس پر غلبہ و تمکن کو اپنے جسد عنصری کی آنکھوں سے دیکھے بغیر دنیا سے رُخصت ہو گئے! لیکن چالیس برس کی مدت کی تکمیل کے بعد بنی اسرائیل کی اُس نئی نسل نے جو صحرا ہی میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی تھی، حضرت یوشع بن نونؑ کی قیادت میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے مراحل طے کیے اور اس طرح بنی اسرائیل کی تاریخ کے عہدِ زریں کے آغاز کی تمہید ہوئی۔

بنی اسرائیل اور اُمّتِ مسلمہ کے حالات میں عمومی مشابہت

واضح رہے کہ اگرچہ نظری طور پر تو یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ جتنے رسول دنیا میں مبعوث ہوئے اتنی ہی مسلمان اُمتیں بھی لازماً وجود میں آئی ہوں گی، خواہ بڑی خواہ چھوٹی، لیکن قرآن حکیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اہم ترین قابل لحاظ اور قابل ذکر اُمتیں دو ہی ہیں: پہلی اُمتِ موسیٰؑ یعنی بنی اسرائیل اور دوسری اُمت محمدؐ یا موجودہ اُمتِ مسلمہ!

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں بڑی گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک جانب خارج سے وارِد و واقع ہونے والے حالات و واقعات کے ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظِ مبارکہ منقول ہیں:

﴿لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ كَمَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ﴾ (ترمذی عن عبداللہ بن عمرو)

''میری اُمت پر بھی مصائب و حوادث اسی طرح واقع ہوں گے جیسے بنی اسرائیل پر ہوئے بالکل، ایسے جیسے ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے۔''

اور دوسری جانب امت کے داخلی احوال و کوائف اور اعمال[1] و اشغال کے ضمن میں آپؐ نے یہ فرمایا ہے کہ:

﴿''لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ تَبِعْتُمُوْهُمْ''قِيْلَ:''يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَلْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى؟'' قَالَ: ''فَمَنْ؟''﴾ (بخاری و مسلم عن ابی سعید خدری)

''......حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لازماً ان لوگوں (کے طور طریقوں) کی پیروی کرو گے جو تم سے پہلے گزرے ہیں، بالشت کے ساتھ بالشت اور ہاتھ کے ساتھ ہاتھ (کے انداز میں)، یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بل میں گھسے تھے تو تم بھی ان کی پیروی کرو گے''۔ پوچھا گیا: ''حضور کیا یہود اور نصاریٰ (مراد ہیں؟''فرمایا: ''تو اور کون؟''

(اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا)

[1] ان سطور کے راقم نے جب اس حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشنی میں اُمتِ مسلمہ کی تاریخ کا بنظر غائر جائزہ لیا تو اسے اُمت کی گزشتہ چودہ

سو سالہ تاریخ کے دوران دوبارہ عروج اور دو ہی بار زوال کا بعینہٖ وہی نقشہ نظر آیا جو بنی اسرائیل کی تاریخ کے خلاصے کے ضمن میں سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ اب سے ٹھیک گیارہ سال قبل راقم نے اپنے اسی مشاہدے اور غور و فکر کے نتیجے کو میثاق بابت اکتوبر نومبر ۱۹۷۴ء میں شائع کر دیا تھا اور اب وہ تحریر راقم کی تالیف ''سرافگندیم'' میں بطورِ مقدمہ شامل ہے اور برادرم ڈاکٹر ابصار احمد کے قلم سے اس کا انگریزی ترجمہ "Rise And Decline Of The Muslim Ummah" کے نام سے مطبوعہ موجود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس حدیث مبارک کی عظمت اور صدقِ صد حقانیت کا کسی قدر اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب انسان بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے عائد شدہ اُس مفصل فردِ جرم کی روشنی میں اُمتِ مسلمہ کی موجودہ دینی و اخلاقی اور ایمانی و عملی حالت کا جائزہ لیتا ہے جو سورۂ بقرہ کے چھٹے رکوع سے شروع ہو کر پندرھویں رکوع کے آغاز تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ کوئی نظری و فکری، اعتقادی و ایمانی اور اخلاقی و عملی گمراہی ایسی نہیں ہے جو سابقہ اُمت میں پیدا ہوئی ہو اور موجودہ اُمتِ مسلمہ اس سے بچی رہ گئی ہو۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی تو بالکل ایسے لگتا ہے جیسے کہ یہ سارا خطاب ''در حدیث دیگراں'' کے انداز میں اصلاً اُمتِ محمد ﷺ ہی سے ہو رہا ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ
اور
تاریخ بنی اسرائیل کے ابتدائی دور کے مابین
حیرت انگیز مماثلت

متذکرہ بالا کلی مشابہت اور مماثلت کے ساتھ ساتھ بعض جزوی مشابہتوں کا معاملہ مزید حیران کن ہے۔ بالخصوص برصغیر پاک و ہند کی مسلمان قوم کی ماضی قریب کی تاریخ اور ملتِ اسلامیہ پاکستان کے موجودہ احوال و کوائف اور تاریخ بنی اسرائیل کے اولین دور کے حالات و واقعات کے مابین جو مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے اُس کو شائد کوئی دوسری نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہ مل سکے۔

بنی اسرائیل کی معجزانہ نجات

سب جانتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں آباد ہونے کے بعد کئی صدیوں تک بنی اسرائیل مصر میں نہایت عیش و آرام کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد تدریجاً حالات میں انقلاب آیا اور اُن پر شدائد و مصائب کے اُس دور کا آغاز ہو گیا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے متصلاً قبل اپنے نقطۂ عروج (Climax) کو پہنچ گیا۔ بنی اسرائیل اُس زمانے میں جن حالات سے دوچار تھے اُن کی تعبیر قرآنِ کریم کے متعدد مقامات پر قلیل فرق و تفاوت کے ساتھ اِن الفاظ میں ہوئی ہے:

﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝﴾ (البقرہ ۴۹)

''......وہ چکھاتے تھے تمہیں بدترین عذاب کا مزہ (یہاں تک کہ) ذبح کر ڈالتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رکھتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں یقیناً تمہارے لیے تمہارے رب کی جانب سے بڑی آزمائش تھی۔''

(واضح رہے کہ سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۴۱ میں بھی یہ الفاظ مبارکہ جوں کے توں وارد ہوئے ہیں، صرف اس ایک فرق کے ساتھ کہ ''یُذَبِّحُوْنَ'' کی بجائے ''یُقَتِّلُوْنَ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے)، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہی اللہ تعالیٰ کے اِس ارادے اور مشیت کے ساتھ ہوئی تھی کہ ان کے ذریعے بنی اسرائیل کو اِس عذاب سے نجات دلائی جائے، چنانچہ سورۂ قصص میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ۝﴾ (القصص:۵)

''...........اور ہم چاہتے تھے کہ احسان فرمائیں ان لوگوں پر جنہیں زمین میں دبالیا گیا تھا اور بنادیں ان ہی کو سربراہ اور بنادیں ان ہی کو (زمین کا) وارث۔''

اور اگرچہ آنجناب ؑ کی بعثت کے مقاصد میں وہ جملہ اُمور بھی لازماً شامل تھے جن کے لیے تمام انبیاء و رسل مبعوث کیے گئے یعنی دعوت الی اللہ اور شہادت علی الناس، تاہم آپ ؑ کی بعثت کا ایک خصوصی مقصد بنی اسرائیل کی نجات تھا۔ یہی وجہ ہے کہ منصب رسالت پر فائز ہونے کے بعد فرعون سے اپنی پہلی ہی ملاقات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام پر مطالبہ پیش فرمادیا کہ:

﴿اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ﴾ (طٰہٰ:۴۷)

''......ہم دونوں تمہاری جانب تمہارے رب کے پیغامبر ہیں۔ پس بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دو اور اُن کو مت ستاؤ۔''

اِس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ، انذار و تبشیر اور فرمائش و فہمائش پر فرعون اور آلِ فرعون کی جانب سے کیا ردِّعمل ظاہر ہوا۔ اور کس طرح ''تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ'' (بنی اسرائیل:۱۰۱) یعنی نو عظیم معجزات دیکھنے کے باوجود ؏

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کے مصداق نہ صرف یہ کہ اُن کے کفر و اعراض اور تعلّی و اِستکبار میں اضافہ ہوتا چلا گیا، بلکہ خود بنی اسرائیل پر اُن کے تشدد کی شدت بڑھتی چلی گئی۔ بہرحال یہ طویل داستان جس نتیجے پر منتج ہوئی وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے پے بہ پے معجزات کے ذریعے نجات عطا فرمائی۔ چنانچہ اُن کی نگاہوں کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کی ایک ہی ضرب سے سمندر پھٹا جس سے اُن کے بچ نکلنے کی سبیل پیدا ہوئی۔ پھر عین اُن کی نگاہوں کے سامنے اُن کا دشمن پورے لاؤ لشکر سمیت غرق ہوا، پھر عصا کی ایک ہی ضرب سے ایک چٹان سے اُن کے لیے پانی کے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، بے آب و گیاہ بیابان میں اُن کے لیے من و سلویٰ کی صورت میں غذا نازل فرمائی گئی، انہیں دُھوپ کی شدت و تمازت سے بچانے کے لیے غمام کا اہتمام کیا گیا۔ بعد ازاں الواح کی صورت میں تورات عطا فرمائی گئی، اور اُس کی پیروی اور شریعت کی پابندی کا عہد و میثاق لیتے ہوئے کوہِ طور کو ان کے سروں پر معلّق کر دیا گیا۔

موضوعِ زیر بحث کے اعتبار سے اصل غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ ہجرت سے قبل مصر میں آلِ فرعون کے ساتھ بھی ''تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ'' کا مشاہدہ بچشم سر کر چکنے اور پھر سفرِ ہجرت کے دوران متذکرہ بالا جملہ آیات و معجزات کا مشاہدہ ہی نہیں تجربہ کر چکنے کے باوجود بنی اسرائیل نے اللہ کے جلیل القدر پیغمبر ؑ اور اپنے عظیم نجات دہندہ کے ساتھ مسلسل نافرمانی اور اذیت رسانی کا وہ طرزِ عمل کیوں اختیار کیا، جس پر رسول ؑ کو یہ فریاد کرنی پڑی کہ:

﴿يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ﴾ (الصّف:۵)

''......اے میری قوم کے لوگو! مجھے کیوں اذیت پہنچا رہے ہو درآں حالیکہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری جانب اللہ کا رسول ہوں۔''

اس لیے کہ اُن کے اسی طرزِ عمل کا نقطۂ عروج ہے وہ واقعہ جس کا آغاز میں ذکر ہو چکا ہے، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تمام تر ترغیب و تحریض اور فرمائش و فہمائش کے باوجود ''قتال فی سبیل اللہ'' سے اعراض و انکار۔ جس کی پاداش میں اُن پر چالیس سالہ صحرا نوردی مسلط کر دی گئی چنانچہ وہ چالیس برس

بیابانِ سینا ہی میں (In The Wilderness Of Sina) بھٹکتے رہے اور ''یَتِیْھُوْنَ فِی الْاَرْضِ'' کی مناسبت سے اُس کا نام ہی ''صحرائے تیہہ'' پڑ گیا۔ پھر اسی مسئلے کا تتمہ یا تکملہ ہے یہ سوال کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اُسی قوم کی اگلی نسل میں اتنی ہمت وعزیمت پیدا کر دی اور اُس کی اِس درجہ کایا پلٹ کر رکھ دی کہ اس کے باوجود کہ وہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام جیسے جلیل القدر پیغمبروں کی صحبت ومعیت سے محروم ہو چکے تھے اور ان کی سربراہی ورہنمائی کے فرائض وہ شخص ادا کر رہا تھا، جس کی نبوت ورسالت کا کوئی صریح ثبوت کم از کم قرآن حکیم میں موجود نہیں ہے۔ (یعنی حضرت یوشع بن نونؑ) تاہم انہوں نے اس کی سرکردگی میں جہاد وقتال فی سبیل اللہ کے جملہ مراحل بحسن وخوبی طے کیے۔ چنانچہ وہ ارضِ مقدس جو چالیس برس تک کے لیے ان پر حرام کر دی گئی تھی، اُن کے ہاتھوں فتح ہوئی اور ان کے دورِ غربت کا خاتمہ اور دورِ عروج کا آغاز ہو گیا؟

ظاہر ہے کہ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ممکن ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معیت میں مصر سے نکلے تھے، وہ نسلاً بعد نسلٍ غلامی کی چکی میں پستے رہنے کے باعث بزدل اور بودے ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایک جانب اُن میں سے اکثر کی غیرت وحمیت کچلی جا چکی تھی اور دوسری جانب وہ عزیمت ومقاومت سے عاری اور تہی دست ہو چکے تھے، اور ماضیٔ قریب کی شدید ترین تعذیب (Persecution) نے تو گویا اُن کے حوصلے اور قوتِ ارادی کا جنازہ نکال دیا تھا، چنانچہ وہ مصر میں شدید ترین محنت ومشقت تو کرتے تھے، لیکن خود اپنے عزم وارادے کی اساس پر نہیں بلکہ آلِ فرعون کے کوڑوں اور ڈنڈوں کے خوف سے۔ اِس کے برعکس بنی اسرائیل کی جس نسل نے جہاد وقتال کی پُرعزیمت راہ اختیار کی وہ، وہ تھی جو آزادی کی فضا میں پیدا ہوئی اور اسی فضا میں پلی بڑھی اور پروان چڑھی، چنانچہ اُن میں غیرت وحمیت کے اوصاف بھی پیدا ہوئے اور عزتِ نفس اور خودداری کے احساسات بھی۔ اور اس سونے پر سہاگے کا کام کیا صحرا کی پُرصعوبت زندگی نے جس سے اُن میں سخت کوشی اور جفاکشی کی عادت پیدا ہوئی اور بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

مسلمانانِ ہند پر انگریز کی دوسوسالہ غلامی کے اثرات

ان حقائق کی روشنی میں اب ذرا غور کیجیے مسلمانانِ ہند کی ماضی قریب کی تاریخ اور ملت اسلامیہ پاکستان کی موجودہ صورتِ حال پر!

صنم خانۂ ہند میں اسلام کا ورودِ اوّل ۷۱۲ء میں ہوا اور اس وقت سے لے کر ۱۷۵۷ء تک یعنی ایک ہزار سال سے زائد عرصہ برصغیر پر مسلمانوں نے جزوی یا کلی طور پر حکومت کی! اس کے بعد لگ بھگ دو سو برس انگریز کی غلامی میں گزرے اور اس دوصد سالہ غلامی کے دَوران برصغیر کے بعض علاقوں میں مسلمانوں کی کم وبیش آٹھ اور بعض علاقوں میں لگ بھگ چھ نسلیں بیت گئیں اور کیسے ممکن تھا کہ اِس کے اثرات ونتائج کا ظہور نہ ہوتا۔

یہ درست ہے کہ ان دوسو برسوں کے دوران انگریز کی جانب سے بڑے پیمانے پر ظلم وتشدد، قتل وغارت اور لوٹ مار کا معاملہ تو ایک ہی بار ہوا یعنی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد۔ اس سے قبل کے سوسالہ دَور میں یا میدانِ جنگ میں کھلے مقابلے کا معاملہ رہا یا میدانِ سیاست کے دجل وفریب، بدعہدی وبےوفائی اور مکاری ودسیسہ کاری کا۔ اور بعد کے نوے سالوں کے دوران بھی اگرچہ دینی حمیت اور جذبۂ حریت سے سرشار بےشمار مسلمان، بالخصوص علماءِ کرام، قید وبند کی صعوبتیں جھیلتے، جیل خانوں میں تعذیب وتشدد کا نشانہ بنتے، پھانسی کے پھندوں میں جھولتے یا حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزائیں پاتے نظر آتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اُن کی کل تعداد ہندوستان کے مسلمانوں کی مجموعی تعداد کے اعتبار سے آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں بنتی۔ تاہم عہد حاضر کے اس بدترین استعمال نے ایک جانب مسلمانانِ برصغیر کی بحیثیت مجموعی غیرت وحمیت اور خودداری وعزت نفس کو کچلنے کے لیے وہ تمام حربے استعمال کیے جو ہمیشہ سے استعماری قوتوں کا معمول رہے ہیں۔ یعنی:

﴿اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ﴾ (النمل:۳۴)

''یقیناً بادشاہ جب کسی بستی (یا ملک) میں (فاتحانہ) داخل ہوتے ہیں تو اس میں فساد برپا کر دیتے ہیں اور اس کے باعزت لوگوں کو ذلیل کر ڈالتے ہیں۔''

جس کی بہترین تعبیر کی ہے علامہ اقبال مرحوم نے اپنے ان اشعار میں ؎

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ ''اِنَّ الْمُلُوْكَ''
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اِک جادو گری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری!
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقہ گردن میں سازِ دلبری!
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری!

نتیجتاً ان دوسو سالوں کے دوران ع

''حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے!''

کے مصداق اسلامیانِ ہند کا جو فرد یا گروہ غیرت وحمیت اور عزتِ نسل کے اعتبار سے جتنا ''ہلکا'' ہوتا چلا گیا اتنا ہی اُوپر اُٹھتا اور سرکار دربار میں ''باعزت'' بنتا چلا گیا اور جن کے قدموں میں غیرت وحمیت کی بیڑیاں رہ گئیں، وہ معاشرتی ومعاشی اعتبار سے پست سے پست تر ہوتے چلے گئے۔ اور دوسری جانب عہدِ حاضر کے اس ''فرعونِ جدید'' نے ''يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ'' کی ایک نئی اور بظاہر بڑی معصوم اور بے ضرر لیکن حقیقتاً حد درجہ مؤثر اور تیر بہدف صورت اختیار کی۔ یعنی ایک نئے نظامِ تعلیم کے ذریعے انگریزی زبان اور مغربی تہذیب وتمدن کی ترویج اور اس ''ثقافتی انقلاب'' کے ذریعے نئی نسلوں کا اپنے ماضی سے کامل انقطاع جو قومی وملی سطح پر قتلِ عام سے ہرگز کم نہیں اور گویا ''يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ'' کی جدید اور مہذب صورت ہے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی مرحوم ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

قومی واجتماعی سطح پر اِس ''کردارکشی'' کا جو نتیجہ نکلا اُسے کسی صاحب درد نے یوں بیان کیا کہ ؎

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں اُلجھ کر اکثر
تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیئے!
نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے عوض
اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے!

اور اِس جلتی آگ پر تیل کا کام کیا ''آزادیٔ نسواں'' کی اُس تحریک نے جس نے ہمارے عائلی وسماجی نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا، خاندان کے مقدس ادارے کی چولیں ہلا دیں، شرم وحیا کا دیوالہ نکال دیا اور عصمت وعفت کے معیارات ختم کر دیئے اور اس طرح گویا ''وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَ كُمْ'' کی ایک جدید تفسیر عملاً پیش کر دی۔

پنجاب اور سرحد کا اضافی المیہ

اِس اعتبار سے بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ وسطی پنجاب اور اس سے ملحقہ صوبہ سرحد کے علاقے کے مسلمان ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ ہی بدقسمت اور مظلوم ثابت ہوئے، اس لیے کہ اُن پر انگریزوں کی غلامی سے متصلاً قبل، اوّلاً سکھوں کی دہشت گردی، لوٹ مار اور قتل وغارت گری اور بعد ازاں باضابطہ ''سکھا شاہی'' مسلط رہی جو یقیناً ''يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ'' کی بدترین صورت تھی۔ نتیجتاً ایک طرف تو اُن کی خودی اور عزتِ نفس زیادہ ہی پامال ہوئی اور اُن کی غیرت وحمیت کچھ زیادہ ہی مجروح ہوئی! اور دوسری طرف انہوں نے انگریز کی آمد کو غنیمت جانا اور اپنی نجات کا ذریعہ سمجھا اور اس طرح ؏

''کہ خود نخچیر کے دِل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!''

کی صورت پیدا ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ اِس علاقے کے مسلمانوں نے اوّلاً ۱۸۵۷ء میں انگریز کی مدد کی اور اُن ہی کی مدد سے انگریزوں نے دوبارہ دہلی کو فتح کیا اور ثانیاً یہاں کے ''اعلیٰ'' طبقات نے انگریز کے ''ثقافتی انقلاب'' کا دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ ہی دلی آمادگی سے خیر مقدم کیا اور ان کے دِلوں میں انگریز کے خلاف نفرت وبغاوت کے وہ جذبات کبھی پیدا نہ ہو سکے جو بقیہ ہندوستان کے اُن مسلمانوں کے دِلوں میں پیدا ہوئے جن سے انگریز نے براہِ راست حکومت چھینی تھی۔

ہندوؤں کی جانب سے انتقامی طرزِ عمل کا اندیشہ

مزید غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ ہندوستان کی مسلمان قوم کا المیہ دوہرا تھا۔ اس لیے کہ جہاں ایک جانب انگریز کی غلامی کے نتیجے میں اُن کی غیرت وحمیت، ہمت وعزیمت اور خودی وعزتِ نفس کے سوتے خشک ہو رہے تھے، وہاں دوسری جانب اُن ابنائے وطن کے دِلوں میں اُن کے خلاف نفرت و انتقام اور بغض وعداوت کے جذبات پروان چڑھ رہے تھے جن پر اُنہوں نے ہزار سال سے زائد عرصہ تک حکومت کی تھی۔ نفرت وانتقام کے اس جذبہ کو اوّلین شہ تو اگرچہ بیرونی استعمار ہی سے ملی تھی لیکن بعد ازاں یہ خود ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر گیا تھا اور اس کی جڑیں زمین میں بہت گہری اُتر گئی تھیں اور آزادیٔ ہند سے متصلاً قبل تو یہ جذبۂ نفرت وانتقام ایک خوفناک عفریت کی مانند چنگھاڑتا ہوا بڑھتا نظر آ رہا تھا۔ اس سب پر مستزاد یہ کہ مسلمانانِ ہند اپنے ابناءِ وطن کے مقابلے میں تعداد کے اعتبار سے تو ایک تہائی تھے ہی، تعلیم وتنظیم اور سرمایہ ووسائل کے اعتبار سے بھی بہت پیچھے تھے۔ نتیجتاً ایک شدید خوف اور سراسیمگی کی حالت اُن پر طاری ہوگئی تھی۔

پاکستان کا معجزانہ قیام اور معجزے کا فوری سبب

ان حالات میں واقعہ یہ ہے کہ برصغیر میں بسنے والے مسلمانوں کی اکثریت کا بیک وقت انگریزوں کی بالفعل موجود اور ہندوؤں کی ممکنہ قابل حذر غلامی سے نجات پا کر ایک آزاد اور خودمختار ملک کا مالک بن جانا، اور دنیا کے نقشے پر وقت کی عظیم ترین مسلمان مملکت کا دفعتۃً ظہور ہرگز ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ اور یہ معجزہ بھی، جیسے کہ ہم انشاء اللہ بعد میں تفصیلاً واضح کریں گے صرف ایک ہی واقعہ کے معجزانہ ظہور کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے متذکرہ بالا سلسلۂ معجزات کے مانند متعدد معجزات کا مجموعہ ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے اِس سوال کا جواب بھی سامنے آ جانا چاہئے کہ یہ معجزہ کیوں رُونما ہوا؟

جن لوگوں کی نگاہیں ''يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' (الروم: ۷) کے مصداق صرف ''ظاہر'' تک ہی محدود رہتی ہیں اور جن کا غور وفکر حیاتِ دنیوی اور نظام کائنات گویا آفاق وانفس کے ضمن میں صرف مادی اسباب وعلل اور ان کے نتائج وعواقب ہی تک محدود رہتا ہے، انہیں تو شاید یہ بہت دور کی کوڑی نظر آئے لیکن جو اس نظامِ عالم کے ''باطن'' سے بھی کسی قدر شناسا ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ پورا سلسلۂ اسباب ایک مسبب الاسباب تبارک وتعالیٰ کے ارادہ و مشیت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، وہ اگر قرآن حکیم کی آیات بینات پر غور کریں تو اس حقیقت کو پالیں گے کہ یہ اللہ عزوجل کی سنت ثابتہ رہی ہے کہ جب کوئی فرد اور بالخصوص کوئی قوم اللہ سے کوئی وعدہ کرتے ہوئے کسی چیز کا سوال کرتی ہے تو اللہ اُسے وہ چیز عطا فرما کر ایک موقع ضرور عنایت فرماتا ہے کہ وہ اپنے قول کی صداقت اور وعدے کی سچائی ثابت کر سکے۔

قومی واجتماعی سطح پر تو اس سنت اللہ کی جانب واضح اشارہ تاریخ بنی اسرائیل کے ضمن ہی میں موجود ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۲۹ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول نقل ہوا ہے:

﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ○﴾

''......قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں زمین میں خلافت عطا فرما دے اور پھر دیکھے کہ تم کیا روش اختیار کرتے ہو۔''

اور شخصی وانفرادی سطح پر منافقین مدینہ کے ایک گروہ کے رویے کے ضمن میں اس سنت اللہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ کی آیات ۷۵،۷۶ میں مذکور ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○﴾

''......اُن میں سے بعض وہ بھی ہیں، جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے (دولت) عطا فرمائے گا تو ہم خوب خیرات کریں گے اور لازماً نیک لوگوں میں سے ہو جائیں گے۔ پھر جب اللہ نے اُن کو اپنے فضل سے نوازا تو انہوں نے اس میں بخل کیا اور رُخ موڑ لیا پہلوتہی کرتے ہوئے۔

خوب اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ قیامِ پاکستان کا معجزہ بھی اسی سنت اللہ کے تحت ظاہر ہوا۔ اِس لیے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ تحریک پاکستان کے عوامی اور جذباتی دَور میں جو ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ء دو سالوں پر مشتمل ہے پورا برصغیر از درّۂ خیبر تا راس کماری اور از مکران تا چاٹگام اس نعرے سے گونج اُٹھا تھا کہ ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الاّ اللہ'' اور تحریک کے زعماء وعمائد کے صریح اور بانگ دہل اعلانات و بیانات پر مستزاد جمعہ اور عیدین کے عظیم اجتماعات میں

کروڑوں مسلمانوں نے گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں کی تھیں اور عہد کیا تھا کہ اے اللہ! ہم اس دوہری غلامی سے نجات پا کر صرف تیرے بندے بن کر رہیں گے اور تیرے اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دین پر عمل پیرا ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ اسی عہد و میثاق کا نتیجہ تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے حالات کا رُخ بدل گیا، کایا پلٹ کر رہ گئی اور زنجیریں کٹتی چلی گئیں۔ بقول اقبال ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں!

قیامِ پاکستان کے بعد کا طرزِ عمل

ملت اسلامیہ پاکستان کا آزادی کے بعد کا طرزِ عمل بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کے طرزِ عمل سے بہت مشابہ و مماثل ہے۔ نتیجتاً جس صورتِ حال سے وہ دوچار ہوئے اور جس کیفیت میں وہ تا حال مبتلا ہیں وہ بھی نہ صرف بنی اسرائیل کے مشابہ و مماثل بلکہ بعض اعتبارات سے اُن سے بھی بدتر اور مایوس کن ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی آزمائش تو بڑی کڑی تھی اِس لیے کہ انہیں ''ملک'' کے حصول کے لیے جنگ کی دعوت دی گئی تھی، جس پر اُن کی کئی سو سالہ غلامی کے اثرات کا ظہور ''بزدلی'' کی صورت میں ہوا۔ یہاں بغیر جنگ و قتال دو وسیع و عریض خطوں پر مشتمل ایک عظیم الشان مملکت عطا فرما دی گئی تھی اور اب صرف اپنے قول کی صداقت اور وعدہ کی سچائی ثابت کرنے کی ضرورت تھی، لیکن افسوس کہ یہاں دو صد سالہ غلامی کے اثرات کا ظہور ''وعدہ خلافی'' کی صورت میں ہوا اور ملت اسلامیہ پاکستان بحیثیت مجموعی اپنی تمام دعاؤں اور التجاؤں اور درخواستوں اور عرضداشتوں کو بھلا کر اور کل عہد و میثاق اور قول و قرار کو فراموش کر کے آزادی کے مادی ثمرات اور دنیوی انعامات سمیٹنے کے ضمن میں تکاثر و تنافس اور مقابلہ و مسابقت کی دوڑ میں مگن ہی نہیں گم ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ یہاں سزا بھی دوہری ملی۔

بے یقینی اور بے مقصدیت کا صحرائے تیہہ

ایک بے یقینی اور بے مقصدیت کے صحرائے تیہہ میں سرگردانی کی کیفیت جس کی شدت میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا اور تا حال ہو رہا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ پاکستان دولخت ہوا اور نہ صرف یہ کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے علیحدہ ہوا، بلکہ اُس نے اپنا نام بھی تبدیل کر لیا اور اس طرح گویا اپنے تعارف و تشخص ہی کو بدل ڈالا اور اپنے ماضی سے کم از کم وقتی طور پر لاتعلقی اختیار کر لی اور یہ بھی اسی کا مظہر ہے کہ تا حال یہ دونوں خطے ملکی، قومی اور سیاسی و دستوری سطح پر عدم توازن اور عدمِ استحکام کا شکار ہیں اور فانی کے اس شعر کا مصداق کامل بنے ہوئے کہ ؎

ہم تو فانی جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا!

یا اس شعر کا کہ ؎

سنی حکایتِ ہستی تو درمیان سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

جس کی منطقی انتہا یہ ہے کہ ؎

''نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو یہ بھی کیا معلوم!''

چنانچہ ایک طرف اپنا حال یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے اغراض ومقاصد ہی بحث ونزاع کا موضوع اور اختلاف وانتشار کا عنوان بنے ہوئے ہیں اور اس ضمن میں بڑوں کے پیدا کردہ انتشارِ ذہنی کا نتیجہ یہ ہے کہ نئی نسل حیران وپریشان ہے کہ ''پاکستان کیوں معرضِ وجود میں آیا تھا؟'' اور آیا اُس قافلہ ملی کی کوئی منزل مقصود تھی بھی یا نہیں جس نے پاکستان حاصل کیا؟ بلکہ یہاں تک کہ آیا تقسیم ہند کا کوئی جواز تھا بھی کہ نہیں؟ نتیجتاً ملی وقومی سطح پر ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں، چنانچہ زعماء وقائدین اور اصحاب فکر ودانش تک کی سعی وجہد اور تگ وتاز کا حال اِس مصرعہ کا مصداق ہے کہ ع

''آہ! وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!''

تو بے چارے عوام کا کیا قصور اگر وہ اس شعر کے مصداق کامل بن گئے ہوں کہ ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اِک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اور اِس صورتِ حال کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ اپنی عمر کے چالیسویں سال میں بھی ریاست کے دستورِ اساسی کے اعتبار سے ''سلطنت خداداد پاکستان'' ہنوز روزِ اوّل است'' کا نقشہ پیش کررہی ہے اور اس شعر کی مصداق اتم ہے کہ ؎

اس سوچ میں کلیاں زرد ہوئیں اس فکر میں غنچے سوکھ گئے
آئین گلستان کیا ہوگا؟ دستورِ بہاراں کیا ہوگا؟

اور دوسری طرف اغیار پھبتیاں چست کررہے ہیں۔ چنانچہ کوئی کہتا ہے کہ پاکستان تاحال کسی تشخص کی تلاش میں ہے،[۱] اور کوئی فیصلہ صادر فرمادیتا ہے کہ پاکستان اپنا جواز کھو چکا ہے،[۲] اور کوئی اس سے بھی آگے بڑھ کر فیصلہ کن انداز میں پیشگوئی کردیتا ہے کہ پاکستان ٹوٹنے ہی والا ہے اور اس کے حصے بخرے ہونے ہی والے ہیں۔[۳]

۱ "Pakistan is Still in Search of an Identity"

۲ "Pakistan Has Lost its Rationale"

۳ "Pakistan is at the Verge of Disintegreation or Further Blakanistion"

نفاقِ عملی اور پستی کردار

دوسری سزا جس سے ملت اسلامیہ پاکستان اس وقت دوچار ہے وہ یہ کہ ایکقلیل اقلیت کو چھوڑ کر پوری قوم ''نفاقِ عملی'' کی اُس کیفیت میں مبتلا ہوچکی ہے جس کا نقشہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اِن احادیث مبارکہ میں سامنے آتا ہے۔

﴿ا۔عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ''اية المنافق ثلاث'': ذاد مسلمٌ، وإن صامَ وصَلّٰى وزعَمَ انّهٗ مسلمٌ ثُمَّ اتفقا ''اذا احدَّثَ كَذَبَ واذا وَعَدَ اَخلَفَ وإذائتُمِنَ خَانَ''﴾ (بخاری ومسلم)

''......حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''منافق کی نشانیاں تین ہیں۔'' یہاں امام

مسلمؒ نے مزید الفاظ روایت فرمائے ہیں کہ ''خواہ وہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو۔'' اس کے بعد بخاری و مسلم کے متفق علیہ الفاظ ہیں کہ: ''جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے اور جب امانت کا حامل بنایا جائے خیانت کا ارتکاب کرے۔''

﴿۲۔ "وعن عبداللہ ابن عمروؓ قال قال رسُول اللہ علیہ وسلم: اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ منهن كانت فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا: اِذَااؤتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذا خَاصَمَ فَجَرَ" ﴾ (متفق علیہ)

''......حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چار باتیں جس شخص میں موجود ہوں گی، وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی اس میں اسی کی نسبت سے نفاق ہوگا، یہاں تک کہ اُسے چھوڑ دے۔ جب امانت کا حامل بنایا جائے خیانت کا ارتکاب کرے، جب بات کرے جھوٹ بولے، جب عہد کرے تو بے وفائی کرے اور جب (کسی سے) جھگڑے تو آپے سے باہر ہو جائے۔''

چنانچہ یہ اسی کا مظہر ہے کہ ہم قومی و ملی سطح پر اخلاق کا دیوالہ نکل جانے کی کیفیت (Moral Crisis) سے دوچار ہیں۔ آٹے میں نمک کی حیثیت کے حامل افراد کو علیحدہ رکھتے ہوئے واقعہ یہ ہے کہ قومی اور اجتماعی سطح پر صداقت و امانت اور شرافت و مروت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اور ایفائے عہد اور پاس امانت کا دُور دُور تک نشان نہیں ملتا۔ انفرادی اعتبار سے خالص خود غرضی اور عریاں مفاد پرستی کا دَور دَورہ ہے اور قومی مصالح اور ملی مفادات سے کسی کو کوئی غرض نہیں رہی، معاملات میں بدعہدی اور بددیانتی، بلکہ باضابطہ مکاری اور چالبازی کی گرم بازاری ہے۔ تجارت اور لین دین میں دھوکے اور فریب سے بھی بڑھ کر کھانے پینے کی چیزوں، حتیٰ کہ ادویات تک میں ملاوٹ گویا معمولی بات بن کر رہ گئی ہے۔ سرکاری محکموں اور دفتروں میں رشوت ستانی کا بازار تو گرم ہے ہی، باضابطہ اذیت رسانی اور لوگوں کی عزتِ نفس کو مجروح کرنا تفریح اور مشغلے کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ اور معاشرتی اور سماجی سطح پر سنگدلی اور سفا کی نے ڈیرے جما لیے ہیں تو سیاسی و حکومتی سطح پر بھی جھوٹ اور وعدہ خلافی نے Order of the Day کی صورت اختیار کر لی ہے اور ہر سوچنے سمجھنے والا اور حساس شخص حیران و پریشان ہے کہ ؎

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!

نفاقِ عملی کا سبب اور اس کا قابل حذر انجام

''نفاقِ عملی'' کی یہ کیفیت جس کا ہلکا سا نقشہ سطور بالا میں کھینچا گیا ہے، براہِ راست نتیجہ ہے اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کی خلاف ورزی کا۔ چنانچہ اس سے قبل سورۂ توبہ کی آیات ۷۵، ۷۶ کے حوالے سے نفاق کی جس خاص قسم کا ذکر ہوا ہے، اُس کے بارے میں آیت نمبر ۷۷ میں صراحت موجود ہے کہ یہ بدعہدی کی سزا کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۝﴾ (توبہ)

''......تو اللہ نے سزا کے طور پر اُن کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا اُس دن تک کے لیے جب وہ اس کے حضور حاضر ہوں گے، یہ سبب اس کے کہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اُس کی خلاف ورزی کی اور بوجہ اس جھوٹ کے جو وہ بولتے تھے۔''

اس آیہ مبارکہ میں ایک لرزہ طاری کر دینے والی وعید بھی ہے کہ ''یہ نفاق اب اس دن تک قائم رہے گا جس دن یہ لوگ اللہ کے حضور میں پیش ہوں گے۔''اس پر قیاس کرتے ہوئے ملتِ اسلامیہ پاکستان کے مستقبل کے بارے میں یاس اور نا اُمیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے نگاہوں کے سامنے چھا جاتے ہیں اور اس ضمن میں اس سے بھی بڑھ کر لرزہ انگیز ہے اسی سورۂ مبارکہ کی آیت نمبر ۱۱۰، وَھِیَ ھٰذِہٖ:

﴿لَا یَزَالُ بُنْیَانُھُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَۃً فِیْ قُلُوْبِھِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُھُمْ ۝﴾

''......(نفاق کی) جو عمارت ان لوگوں نے تعمیر کر لی ہے اب یہ ان کے دلوں میں شکوک وشبہات کی صورت میں ہمیشہ برقرار رہے گی۔ الاّ یہ کہ اُن کے دل (خود) ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔''

اور اس سے ذہن بے اختیار منتقل ہو جاتا ہے اُن متذکرہ بالا پیشگوئیوں کی طرف جو پاکستان کے مستقبل کے بارے میں دُنیا کے بہت سے سیاسی تجزیہ نگار کر رہے ہیں کہ یہ اپنی یک جہتی اور سلامتی کو برقرار نہیں رکھ سکے گا اور مستقبل قریب میں مزید حصے بخرے ہونے کے عمل (Balkanisation) سے دوچار ہو جائے گا۔

﴿اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اَعِذْنَا مِنْ ذٰلِکَ﴾

''اے اللہ! اے ہمارے رب! ہمیں اس انجام سے بچا اور اپنی پناہ میں رکھ۔''

الغرض، بے یقینی اور بے مقصدیت کے دھندلکوں پر انفرادی اور اجتماعی اخلاق کے اس دیوالہ پن اور نفاقِ عمل کے گھٹا ٹوپ اندھیروں نے بالکل ''ظُلُمٰتٌ بَعْضُھَا فَوْقَ بَعْضٍ''[1] کی کیفیت پیدا کر دی ہے اور ملک وملت کے مستقبل کو نہایت تاریک بنا کر رکھ دیا ہے، اور حالات وواقعات کے اس ''صغریٰ'' کو قوموں کے عروج وزوال کے ضمن میں قدرت کے اٹل اُصولوں اور اسباب وعلل اور عواقب ونتائج کے باہمی لزوم کے ''کبریٰ'' کے ساتھ جوڑ کر قیاس کیا جائے تو حاصل سوائے مایوسی اور نا اُمیدی کے اور کچھ نہیں بنتا اور حساب کتاب کے کسی بھی قاعدے سے اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔

[1] سورۂ نور آیت نمبر ۴۰ ''اندھیرے ہیں ایک دوسرے کے اُوپر تہ در تہ۔''

پاکستان کی عمر کا چالیسواں سال اور اُمید کی ایک کرن

یاس ونومیدی کی اس شدت کے عالم میں، حال ہی میں، راقم الحروف کے شعورِ باطنی کے پردے پر، چالیس سال کی مدت کے حوالے سے اُمید کی ایک کرن جگمگائی ہے اور اس اچانک انتقالِ ذہنی نے کہ ملت اسلامیہ پاکستان نے اپنی عمر کے چالیسویں سال میں قدم رکھ دیا ہے۔ تاریخ بنی اسرائیل کے متذکرہ حوالے کے ناطے میرے نہاں خانہ قلب میں اُمید کا ایک چراغ روشن کر دیا ہے اور اس خیال نے زور باندھا ہے کہ ہماری بھی وہ نئی نسل جو قیام پاکستان کے بعد آزادی کی فضا میں پیدا ہوئی اور آزادی ہی کی فضا میں پروان چڑھی، تا آنکہ اب شعوری پختگی کی عمر کو پہنچ چکی ہے اور اگرچہ فی الوقت اپنے بڑوں کے پیدا کردہ انتشارِ ذہنی وفکری کے باعث ''زوالِ علم وعرفاں'' سے بھی دوچار ہے اور اُن ہی کی کوتاہی عمل اور نقضِ میثاق سے پیدا شدہ صورت حال کی بناء پر اخلاقی اور عملی اعتبار سے بھی قابل رشک حالت میں نہیں ہے۔ تاہم غلامی کے منحوس اثرات سے بہرحال محفوظ رہی ہے، لہٰذا غیرت وحمیت اور جرأت وہمت کے اعتبار سے یقیناً پچھلی نسل سے بہتر حالت میں ہے۔ نہ ''ندرتِ افکار'' سے بالکل تہی دست ہے نہ ''جرأت کردار'' سے محرومِ محض۔ اگر کسی طرح اُسے بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا جائے اور اُس منزل کی از سر نو نشاندہی کر دی جائے، جس کے حصول کے لیے آج سے نصف صدی قبل برصغیر پاک وہند کی ملت اسلامیہ نے سفر کا آغاز کیا تھا تو کیا عجب کہ ملت اسلامیہ پاکستان کی عمر کا یہ چالیسواں سال ایک فیصلہ کن موڑ (Turning Point) کی حیثیت حاصل کر لے اور ع

''کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو''

کے مصداق بے یقینی اور بے مقصدیت کے ''صحرائے تیہہ'' میں بھٹکنے والا یہ قافلہ بھی از سر نو مقصد ومنزل کا سُراغ پا کر ایک عزم تازہ اور ولولۂ نو کے ساتھ ع

''ہوتا ہے جادۂ پیما پھر کارواں ہمارا''

کی شان سے سرگرم سفر ہو جائے۔

میرے دل میں دفعتہً جگمگانے والی امید کی اِس روشنی کو بھی تقویت حاصل ہوتی ہے۔قرآنِ حکیم ہی کے ایک مقام سے جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے کہ لوگوں کے کان کھول دیں اور ڈنکے کی چوٹ فرما دیں کہ اگر تم اپنے اعراض وانکار کی موجودہ روش پر قائم رہے تو عذابِ الٰہی لازماً آ کر رہے گا۔ اگرچہ میں یہ نہیں جانتا کہ وہ گھڑی آیا ہی چاہتی ہے اور عذاب بالکل تمہارے سروں پر آ چکا ہے یا ابھی کچھ دور ہے اور حکمت خداوندی اور مشیت ایزدی میں ابھی تمہارے لیے کچھ مزید مہلت باقی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ وَاِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء:۱۰۹)

''......پھر اگر وہ روگردانی کریں تو آپ صاف کہہ دیں کہ میں نے تم سب کو برابر خبردار کر دیا ہے۔اب میں نہیں جانتا کہ جس (عذابِ الٰہی) کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ بالکل قریب ہے یا (ابھی کسی قدر) دور ہے۔''

اور۔

﴿وَاِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ۝﴾ (ایضاً:۱۱۱)

''......اور میں نہیں جانتا شاید کہ یہ (مہلت) تمہارے لیے مزید ایک آزمائش اور ایک وقت معین تک مزید فائدہ اُٹھا لینے کا موقع ہو۔''

گویا عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ابھی ملت اِسلامیہ پاکستان کو بھی مزید مہلت عطا کرے اور اصلاحِ احوال اور تلافی مافات کا ایک اور موقع عنایت فرمائے تا آنکہ وہ صورت پیدا ہو جائے کہ:

﴿لِّیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْۢ بَیِّنَةٍ ؕ﴾ (الانفال:۴۲)

''......تاکہ جسے مرنا ہے وہ مرے (لیکن) قیامِ حجت کے بعد اور جسے جینا ہے وہ جئے (لیکن) حجت (اور بصیرت) کے ساتھ۔''

لیکن اِس کے لیے لازم ہے کہ حقائق کا جرأت کے ساتھ سامنا کیا جائے، ماضی کا بے لاگ جائزہ ہو اور گزشتہ ناکامیوں اور نامرادیوں کے اسباب و علل کا بھرپور اور امکانی حد تک معروضی تجزیہ کیا جائے اور اس کے ضمن میں نہ کسی کے ادب واحترام کو حائل ہونے دیا جائے، نہ کسی کی محبت اور عقیدت کو آڑے آنے دیا جائے، پھر حال کے عوارض وامراض کی صحیح اور گہری تشخیص کی جائے اور اس سارے مواد کو سامنے رکھ کر ایک حقیقت پسندانہ لائحہ عمل تیار کیا جائے اور پھر اللہ تعالیٰ کی نصرت تائید کے بھروسے پر عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا جائے۔

چنانچہ اسی مقصد کے تحت راقم الحروف نے پیشِ نظر تحریر کو سپرد قلم کرنے کا ارادہ کیا تھا اور خاص اسی مقصد کے لیے اُس نے حجاز مقدس کا سفر اختیار کیا۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ آج ۲/صفر المظفر ۱۴۰۶ھ کو بمقام طائف اس طویل تحریر کا ''مقدمہ'' مکمل ہو گیا۔

اللہ گواہ ہے کہ اس سے نہ کسی کی دل شکنی ودل آزادی مقصود ہے، نہ کسی کی توہین وتنقیص اور نہ کسی گزری ہوئی شخصیت پر سبّ وشتم مطلوب ہے، نہ کسی حاضر وموجود شخصیت کی کردار کشی! بلکہ مقصود صرف اور صرف اصلاح ہے، اپنی امکانی حد تک۔

﴿اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِیْقِیْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ﴾ (ہود:۸۸)

''......میرا کوئی ارادہ نہیں ہے سوائے اصلاح کے، جس حد تک میرے امکان میں ہو، اور نہیں حاصل ہے مجھے کوئی توفیق مگر صرف اللہ ہی کے سہارے۔''